عربی زبان دنیا کی اہم ترین زبانوں میں شمار ہوتی ہے اور اس کی مسلمہ اہمیت کے کئی ایک پہلو ہیں مذہبی، علمی، تاریخی، ثقافتی اور ادبی۔ موجودہ مقالہ میں انھی مختلف پہلوؤں پر اجمالی نظر ڈالی گئی ہے۔

عربی زبان کا شمار دنیا کی مہذب اور قدیم ترین زبانوں میں ہوتا ہے۔ جن میں علوم و فنون کا ایک وسیع اور وافر ذخیرہ موجود ہے، جو تہذیب و ثقافت کا بہترین سرمایہ سمجھا جاتا ہے اور اسی بناء پر ان زبانوں کو کلاسیکی زبانیں کہا جاتا ہے لیکن ان میں سے اکثر زبانوں مثلاً سنسکرت، یونانی، لاطینی اور عبرانی کا استعمال متروک ہو چکا ہے۔ لیکن ان کے برعکس عربی اپنی قدامت کے باوجود ایک زندہ زبان ہے عربی اگر ایک طرف اپنے قدیم اور وسیع لٹریچر کے لحاظ سے ایک کلاسیکی زبان ہے تو اس کے ساتھ ہی وہ اس جہت سے ایک زندہ اور حدیث العہد زبان بھی ہے کہ وہ آج بھی دنیا کے ایک وسیع حصہ میں کنار دجلہ سے لے کر اوقیانوس کے ساحل تک مستعمل ہے اور اس خطہ کے چودہ پندرہ ملکوں کی سرکاری زبان ہے۔ صدر اسلام کی عربی فتوحات نے اور زمانہ مابعد کے تاریخی واقعات نے عربی زبان کو دیار عرب کے باہر بھی بہت سے ملکوں میں رائج کر دیا تھا۔ چنانچہ جزیرۃ العرب کے علاوہ عربی زبان آج بھی حسب ذیل ملکوں میں مروج ہے: عراق، کویت، شام، فلسطین، لبنان، مصر، بلاد السودان، لیبیا، تونس، الجزائر، مراکو، سنی گال، نائجیریا اور زنجبار۔ ان کے علاوہ گزشتہ زمانہ میں اندلس، صقلیہ، جزائر موزرقہ، میورقہ اور مڈغاسکر میں بھی مستعمل رہ چکی ہے۔ چنانچہ اپنی وسعت مکانی کے لحاظ سے دنیا کی تمام زبانوں میں انگریزی اور ہسپانی کے بعد عربی تیسرے درجہ پر ہے۔

یہ بات درست ہے کہ جزیرۃ العرب کے مختلف حصوں اور وہاں کے قبیلوں کی زبان میں جزئی اختلاف پایا جاتا ہے اور یہ اختلاف مختلف عربی ملکوں کی دارجہ یعنی عامی زبانوں میں اور بھی بین ہے، لیکن تحریری زبان جو سرکاری دفتروں اور تعلیم یافتہ لوگوں کے ہاں تعلیمی، ادبی اور کاروباری ضروریات کے لئے استعمال ہوتی ہے، تقریباً یکساں ہے۔ اور اپنی ترکیب نحوی اور اصول لسانی کے اعتبار سے وہی قرآن مجید اور جاہلی شعراء کی زبان ہے اور لغۃ فصحیٰ کہلاتی ہے۔ اگرچہ اپنے ارتقاء کے دوران میں یہ لغت فصیحہ مختلف ادوار سے گزر چکی ہے، تمدن کی نیرنگیوں اور جدید علوم وفنون کے وجود میں آنے سے اس کے ذخیرہ الفاظ اور اسلوب بیان میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں، جو ایک طبعی امر ہے لیکن اس سے زبان کی عام ساخت اور بنیادی الفاظ میں اور ان کے مفہوم میں کوئی فرق نہیں آیا۔ لہٰذا عربی زبان باوجود قدیم العہد ہونے کے زمانہ حال کی مہذب اور زندہ زبانوں میں شمار ہوتی ہے اور علمی اور عملی ہر دو لحاظ سے اہم ہے۔ اور یہ وہی مفہوم ہے جس کو احمد شوقی بک مرحوم و مغفور نے ذیل کے اشعار میں ادا کیا ہے:-

ماعلمنا لغیرھم من لسان　　　زال اھلوہُ وھو فی اقبال

بلیت ھاشمٌ وبادت نزار　　　واللسان المبین لیس ببال

عربی زبان کی اہمیت

عربی زبان اور اس کے لٹریچر کے مختلف اور متنوع شعبوں کی تاریخ پر ایک غائر نگاہ ڈالنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ عربی زبان کی اہمیت کے چار وجوہ زیادہ نمایاں ہیں:-

(۱) اولاً عربی اس لحاظ سے اہم ہے کہ وہ اہل اسلام کی دینی زبان ہے۔ کیونکہ قرآن مجید (مسلمانوں کا اساسی دینی اور اخلاقی دستور العمل) اور ارشاداتِ نبویؐ کا سارا مجموعہ یعنی حدیث نبویؐ عربی زبان میں ہے، اور یہ بات بدیہی ہے کہ عربی زبان کے علم کے بغیر قرآن پاک اور حدیث شریف کا محققانہ مطالعہ اور ان سے کامل استفادہ ناممکن ہے۔ اس کے علاوہ اسلامی عبادات میں بھی عربی زبان ہی مستعمل ہے۔

الغرض اسلام اور عربی زبان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اسلام نے سب سے پہلے عربی ہی کو اپنے پیغام کا ذریعہ بنایا تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربی زبان اسلام کے دوش پر چار دانگ عالم میں

پھیل گئی اور بہت سے ملکوں اور قوموں کی زبانوں پر مختلف طریقوں سے اثر انداز ہوئی۔

(۲) عربی زبان کی اہمیت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنے قرون اُولیٰ مغربی مورخین کے قرون وسطیٰ میں جتنے دینی اور دنیوی علوم وفنون پیدا کئے تھے وہ تمام تر عربی زبان میں مدون ہوئے تھے، اور ان کی سیاسی اور تمدنی تاریخ بھی اسی زبان میں قلمبند ہوئی تھی۔ بالفاظ دیگر مسلمانوں کی حضارت وثقافت کی زبان عربی ہی رہی۔ لہٰذا عربی زبان اسلامی تہذیب وتمدن کی کلید ہے، جس کے بغیر ہمارے لئے اسلامی علوم اور اسلامی تمدن وثقافت کے بے بہا خزانوں تک پہنچنا ناممکن ہے۔

(۳) عربی زبان کی اہمیت کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ اس وقت عربی تمام عالم عرب کی واحد علمی، تعلیمی اور سرکاری زبان ہے، نیز تمام عربی ممالک کے درمیان سیاسی اور ثقافتی رابطہ کا کام دیتی ہے جس کا قائم رکھنا ان کی قومی اور سیاسی وحدت کے لئے ازلبس ضروری ہے۔

عربی ممالک کا بلاک فی زماننا سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے بساطِ عالم پر ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ لہٰذا جو شخص اس بلاک کے حالات پوری طرح سمجھنا چاہے، یا کسی اور لحاظ سے اس سے سروکار رکھتا ہو اس کے لئے عربی زبان کا علم بے حد ضروری ہے۔

(۴) عربی زبان نے دیگر اسلامی زبانوں مثلاً فارسی، ترکی، اردو اور سواحلی وغیرہ زبانوں پر اتنا گہرا اثر ڈالا ہے یعنی ان کے ذخیرۂ الفاظ اور اسالیب بیان کے علاوہ ان کے عروض، صرف ونحو اور علم بلاغت کو اس حد تک متاثر کیا ہے کہ عربی کے علم کے بغیر نہ تو ان کے ادبی اور فنی ارتقاء کو سمجھا جا سکتا ہے اور نہ ہی ان کے ادب سے پورا پورا فائدہ اور حظ اٹھایا جا سکتا ہے۔

مذکورہ بالا وجوہ کے علاوہ عربی کی اہمیت کے متعدد پہلو اور بھی ہیں۔ ان کی حیثیت اگرچہ ضمنی اور ذیلی ہے تاہم اہل فکر کے لئے علمی دلچسپی سے خالی نہیں۔ ان کا مختصر بیان انشاء اللہ العزیز اس مقالہ کے آئندہ حصوں میں حسب موقع آئے گا۔

ہمارے موضوع کا یہ ایک اجمالی بیان ہے، اب اس اجمال کی تفصیل سنئے۔

عربی زبان کی دینی حیثیت

عربی زبان کی اہمیت کا سب سے پہلا اور اہم پہلو یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کی دینی زبان ہے۔ اور مسلمان اس دنیا کی آبادی کا پانچواں حصہ ہیں۔ قرآن مجید جو اہلِ اسلام کی دینی اور دنیوی زندگی

کے لئے سرچشمۂ ہدایت ہے، عربی زبان میں نازل ہوا تھا اور اس کے بعد اس کے مطلب و مفہوم کی تشریح کے لئے جو مستند تفسیریں تیار ہوئیں وہ بھی عربی زبان ہی میں لکھی گئی تھیں۔ ان کے ہادی برحق (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی زبان عربی تھی، اس لئے ان کے ارشادات کے مجموعے یعنی کتب حدیث بھی عربی زبان میں مدون ہوئیں، اور ان کی شرحیں بھی اسی زبان میں لکھی گئیں۔ اور حدیث نبوی کے مطالعہ کے سلسلہ میں جو علوم معرض وجود میں آئے مثلاً علم الرجال وغیرہ وہ بھی عربی زبان میں قلمبند ہوئے۔ ہمارے دینی علوم میں تیسرے نمبر پر فقہ ہے۔ مذاہبِ فقہ کے تمام ائمہ نے بھی عربی ہی کو ذریعہ اظہار خیال بنایا، لہٰذا فقہ کی کتابیں بھی طبعی طور پر عربی میں مدوّن ہوئیں، چنانچہ ہمارے دینی مدارس میں فقہ کی جو مختصر یا مطوّل کتابیں درس کے طور پر پڑھائی جاتی ہیں وہ تمام عربی میں ہیں۔ مذکورہ بالا دینی علوم کے علاوہ علم العقائد، علمِ کلام اور مختلف ملل و نحل کے معتقدات کے بارے میں جو جیّد کتابیں لکھی گئی تھیں وہ عربی ہی میں تالیف ہوئی تھیں۔

بیان بالا سے ظاہر ہے کہ عربی زبان کا علم ان لوگوں کے لئے ازبس ضروری ہے جو دین اسلام کا بنظر غائر محققانہ مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ نہ صرف قرآن پاک اور حدیث نبوی جو اسلام کے بنیادی ارکان ہیں، عربی زبان میں ہیں بلکہ باقی دینی علوم بھی جو ان کے تابع ہیں، سب سے پہلے عربی ہی میں مدوّن ہوئے تھے۔ چونکہ اہل اسلام کی زندگی کے تمام اخلاقی، معاشرتی، تمدنی اور سیاسی شعبہ جات مذہبی احکام و عقائد کے زیر اثر ہیں، لہٰذا جو محقق عالم مسلمانوں کے کردار کے اسباب و محرکات کو دریافت کرنا چاہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ شریعتِ اسلام کے اصل مآخذ و مصادر کی طرف رجوع کرے، جو عربی زبان میں مسطور ہیں۔ عربی زبان جانتے کے بغیر کوئی شخص اسلام کے سرچشموں تک براہِ راست نہیں پہنچ سکتا، اور نہ ہی وہ قرآن کریم اور روح اسلام کو سمجھنے کی امید کر سکتا ہے۔ عربی زبان کی مذہبی کتابوں کے جو تراجم دنیا کی دیگر زبانوں میں ہوئے ہیں، وہ عربی مذہبی لٹریچر کی بے پایاں وسعت کے مقابلہ میں اس قدر کم ہیں کہ وہ ہمیں اصل ذخیرہ سے مستغنی نہیں کر سکتے۔

مسلمانوں کی انتہائی بدقسمتی ہے کہ آجکل بعض ایسے کم سواد لوگ بھی قرآن فہمی بلکہ قرآن حکیم کی تشریح و تفسیر کا دعویٰ کرتے ہیں جن کو عربی زبان پر عبور حاصل نہیں ہے۔ انھوں نے نہ تو دینی علوم کی باقاعدہ تعلیم پائی ہے اور نہ ہی کسی جیّد عالمِ دین اور استادِ کامل کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا ہے بغرضیکہ تفسیر القرآن

جیسے ذمہ دارانہ فریضہ کے جو بھی شروط ہیں، ان میں سے وہ ایک بھی شرط پوری نہیں کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قرآن پاک آجکل ایسوں کے ہاتھوں میں (نعوذ باللہ) ایک بازیچۂ اطفال بن گیا ہے۔ ہر کس وناکس اس کی تفسیر کا مدعی ہے اور اپنے خود ساختہ معنے اس میں داخل کر کے قرآن پاک کے حقیقی مفہوم کو اپنے ناقص خیالات کے قالب میں ڈھال رہا ہے۔ ایسے لوگ اپنی من مانی تفسیر کے لئے راستہ صاف کرنے کی غرض سے حدیث نبوی پر بھی ہاتھ صاف کرتے ہیں اور صحت حدیث سے بھی انکار کر دیتے ہیں تاکہ حدیث نبوی میں قرآن کریم کی جو تفسیر ملتی ہے، اس سے آزاد رہ سکیں الغرض ایسے خود ساختہ مفسّروں کی تفسیر القرآن درحقیقت تحریف القرآن کے مترادف ہے۔

خیر یہ ایک جملہ معترضہ تھا، اب میں اپنے اصل موضوع کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

دنیا کے مختلف ملکوں کے مسلمان باشندوں کی ملکی یا قومی زبانیں خواہ کچھ ہوں، ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں دین اس حد تک دخیل ہے کہ عربی زبان سے کسی نہ کسی طرح ضرور واسطہ پڑتا ہے، مثلاً نماز پنجگانہ عربی میں ادا کی جاتی ہے۔ مسلمان باہم دگر ملاقات کے وقت عربی کلمات میں علیک سلیک کرتے ہیں۔ اگرچہ دنیا کی اکثر مہذب زبانوں میں قرآن مجید کے بہت سے تراجم شائع ہو چکے ہیں مگر اس کی تلاوت ہر جگہ اصل عربی میں ہوتی ہے۔ جب کسی گھرانہ میں بچہ پیدا ہوتا ہے تو سب سے پہلے اس کے کان میں یہ الفاظ ڈالے جاتے ہیں: لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللہِ۔ اور عربی زبان کا یہی وہ کلمہ طیبّہ ہے جو مرتے وقت بھی ہر مومن کی زبان پر ہونا چاہیئے۔ یہ ایک لائق ذکر اور قابل غور امر ہے کہ مسلمانوں کے ہر چھوٹے بڑے شہر و قریہ میں صبح سویرے جب لوگ ابھی اپنے بستروں میں محو استراحت ہوتے ہیں، اچانک پاس کی کسی مسجد سے مؤذن کی پُرشوکت اور روح پرور اذان بلند ہوتی ہے: اللہ اکبر، اللہ اکبر الخ اور اس طرح سے ہر روز سب سے پہلے مسلمانوں کے کانوں میں جو الفاظ پڑتے ہیں وہ عربی زبان کے معروف کلمات ہیں جن پر اذان مشتمل ہے۔ اور یہی وہ سماں ہے جس کو علامہ اقبال نے ذیل کے شعر میں بڑی خوب صورتی سے باندھا ہے:-

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

اگرچہ عجمی ملکوں میں عربی کی حیثیت ایک غیر زبان کی ہے مگر وہاں بھی علماء اسلام کا ایک

گروہ کم وبیش موجود ہے جو عربی زبان اور اسلامی علوم کے درس وتدریس میں مصروف رہتا ہے اور چونکہ مسلمانوں کی عام جماعت ان ہی عربی دان علماء سے اپنے دین کا علم حاصل کرتی ہے، اس لئے ان کے توسّط سے بھی عوام کے دل و دماغ عربی زبان کے اثرات کو قبول کرتے ہیں۔

عربی ایک بین الاقوامی زبان ہے

عربی زبان مسلمانوں کے لئے نہ صرف دینی ضروریات کی وجہ سے اہم ہے بلکہ اس لحاظ سے بھی اہمیت رکھتی ہے کہ وہ مختلف اسلامی اقوام کے درمیان تبادلہ خیالات کا ایک نہایت مفید ذریعہ ہے اور ایک مضبوط ثقافتی اور تمدنی رابطہ کا کام دیتی ہے۔ مذہب اسلام اپنے ہر پیرو کے دل میں یہ خوشگوار اور حوصلہ افزا احساس پیدا کرتا ہے کہ وہ ایک وسیع اور وقیع عالمگیر برادری کا فرد ہے اور اس عالمگیر اتحاد کو مضبوط کرنے میں دوسرے درجہ پر عربی زبان ہے، جو وحدت اسلامی پیدا کرنے کا ایک قوی ذریعہ اور اس کا شاندار مظہر بھی ہے۔ تمام اسلامی ملکوں میں عربی کی کم وبیش تعلیم وتدریس ہوتی ہے اور یہ امر خود مسلمانوں کے اپنے اختیار میں ہے کہ وہ عربی کو فروغ دے کر اور اس کی مزید ترویج کر کے اس ذریعۂ اتحاد کو اور زیادہ مضبوط بنائیں۔ عربی کی بین الاقوامی حیثیت ایک ایسا امر واقعی ہے کہ اگر اہل اسلام اس کی اہمیت اور اس کی افادی حیثیت سے بخوبی آگاہ ہو جائیں تو اپنی فلاح وبہبود کے حصول میں اس بیش بہا رابطہ سے بہت کچھ مفید کام لے سکتے ہیں۔

تمام عربی ملکوں کی سرکاری اور تحریری زبان ایک ہی ہے یعنی وہاں جو کتابیں چھپتی ہیں اور جو اخبارات ورسائل شائع ہوتے ہیں وہ فصیح عربی ہی میں تحریر ہوتے ہیں۔ ہر عربی ملک کی عام بول چال کی زبان اس فصیح عربی سے کم وبیش مختلف ہے، لیکن ادبی ضروریات میں مقامی بولیوں (لہجات) سے کام نہیں لیا جاتا۔ گزشتہ صدی میں مصر کے چند ادیبوں نے وہاں کی مقامی بولی (دارجہ) میں کتابیں لکھنے کی طرح ڈالی تھی مگر اس تحریک کو کامیابی حاصل نہ ہو سکی کیونکہ علماء نے اس قسم کی کوششوں کو ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھا ہے اور عوام نے بھی جن کے لئے یہ کتابیں لکھی گئی تھیں، ان پر چنداں توجہ نہیں دی۔ بعض مغربی شاطروں نے عربوں کو وقتاً فوقتاً اس بات کی ترغیب دی ہے کہ وہ اپنی اپنی مقامی بولیوں کو ترقی دے کر ادبی زبان کے درجہ تک پہنچائیں مگر اس قسم کے مشورہ کو بنظر استحسان نہیں دیکھا گیا کیونکہ قوی اندیشہ ہے کہ اس لسانی تفرقہ سے

عالم عرب کی ادبی اور ثقافتی وحدت پارہ پارہ ہو جائے گی۔ چنانچہ ۱۹۱۲ء میں ایتھنز دارالحکومت یونان میں مستشرقین کی بین الاقوامی موتمر کے موقع پر جب اس قسم کی تجویز پیش ہوئی تو ایک مصری نمائندہ نے اٹھ کر کہا کہ یہ ایک عجیب بات ہے کہ تم مغربی لوگ اپنے ہاں تبادلہ خیالات کی سہولت کے لئے مصنوعی زبانیں مثل ESPERANTO، IDO اور VOLAPUK وضع کر رہے ہو اور ہمیں یہ مشورہ دیتے ہو کہ ہم عربی جیسی فصیح اور وسیع زبان کو چھوڑ دیں جو روئے زمین کے کروڑوں مسلمانوں کے درمیان تبادلہ خیالات کا ایک بے نظیر ذریعہ ہے، واللہ! ہم ہرگز ایسا نہیں کریں گے۔

عربی اور دیگر اسلامی زبانیں

اہل اسلام کی اور کئی زبانیں ہیں جن کے مطالعہ کے لئے عربی زبان جاننا ازبس مفید ہے۔ مثلاً فارسی، ترکی، اردو، سندھی، ملائی اور سواحلی۔ ان زبانوں کے ادبیات کا پورا مطالعہ عربی زبان اور ادبیات کے بغیر ناممکن ہے۔ یہ زبانیں نہ صرف عربی حروف میں لکھی جاتی ہیں بلکہ ان میں عربی الفاظ کا وافر ذخیرہ داخل ہو چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس قوم نے اسلام اختیار کیا ہے اس کی زبان میں عربی الفاظ شروع ہی سے بکثرت داخل ہو گئے ہیں۔ پہلے تو دینیات اور فقہ کی اصطلاحات داخل ہوئیں پھر اسلامی تمدن کے دوسرے علوم کی اصطلاحیں آئیں اور آخر میں ایسے کثیر التعداد الفاظ داخل ہو گئے جنہوں نے اس قوم کے اصلی الفاظ کی جگہ لے لی۔

اس کے علاوہ عربی ادب نے دیگر اسلامی قوموں کے ادبیات اور ان کے اسالیب بیان کو بھی بہت کچھ متاثر کیا ہے۔ چنانچہ پروفیسر براؤن اپنی تاریخ ادبیاتِ ایران میں لکھتے ہیں: "یہ ایک یقینی امر ہے کہ ایران، ترکی، اسلامی ہند اور دیگر مسلمان ملکوں کی زبانوں، ان کے ادبیات اور ادائے خیال کے طریقوں کا کافی و شافی علم عربی زبان کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ ہم عربی سے جتنا زیادہ واقف ہوں گے اسی قدر ہم ان زبانوں کے ادبیات کو بہتر طریق پر سمجھ سکیں گے اور ان سے محظوظ ہو سکیں گے۔"

عربی اور فارسی کے تعلقات

فارسی زبان اور ادب پر عربی کا بہت گہرا اثر پڑا ہے۔ جب عربوں نے ساتویں صدی میں ایران کو فتح کیا اور عربی و ایرانی اقوام ایک دوسرے سے متاثر ہوئیں تو ان کے باہمی امتزاج و اختلاط سے آہستہ آہستہ ایران کا نقشہ یکسر بدل گیا۔ اور ایرانیوں کے مذہب، زبان، ادبیات، زندگی اور خیالات میں

ایک عظیم انقلاب آگیا۔ مشہور جرمن مستشرق پروفیسر نولڈکے کا قول ہے کہ "یونانی تہذیب نے ایرانی زندگی کی محض سطح کو چھوا تھا، لیکن عربوں کا مذہب اور ان کے طور طریقے ایران کے قلب و جگر تک اتر گئے"۔ اسلام نے قدیم مجوسی مذہب کی جگہ لے لی اور ایران کی زبان بھی اس حد تک بدل گئی کہ "پہلوی" کی بجائے ایران کی جدید زبان کے لئے "فارسی زبان" کی اصطلاح وضع کرنی پڑی اور اہل ایران نے قدیم پہلوی رسم الخط کو اختیار کر لیا۔ تین چار سو سال تک عربی زبان ایران میں سرکاری اور علمی زبان کی حیثیت سے رائج رہی۔ اور اس کے مقابلہ میں ملکی زبان دبی رہی، چنانچہ چوتھی صدی ہجری تک فارسی میں علمی مضامین اور مباحث بیان کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی تھی اور علمی حلقوں میں اس نے کوئی خاص وقعت حاصل نہیں کی تھی، چنانچہ ابو الریحان محمد بن احمد البیرونی (متوفی ۴۴۰ھ / ۱۰۴۸ء) جو سلطان محمود غزنوی کا ہمعصر تھا، اپنی کتاب الصیدلہ میں (جو ابھی تک مکمل طور پر طبع نہیں ہوئی) عربی اور فارسی کی صلاحیتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

وَالیٰ لِسانِ العرب نقلت العلوم من اقطار العالم فازدانت وحلّت فی الاَفئدۃِ وسَرَت محاسن اللغۃِ منہا فی الشّرایین والاَوردۃِ وان کانت کلُّ اُمّۃٍ تستحلی لغتہا التی الفتہا واعتادتہا واستعملتہا فی مآربِہا مع اُلّافہا وَاَشکالِہا واقیسُ ھٰذا بنفسِی وھی مطبوعۃٌ علیٰ لغۃٍ لو خُلِدَ علمٌ لاستُغرِبَ استغرابَ البعیرِ علی المیزابِ والزرافۃِ فِی العرابِ ثمّ منتقلۃٌ الی العربیۃِ والفارسیّۃِ فَاَنا فِی کُلِّ واحدۃٍ دَخِیلٌ ومتکلّفٌ والھجوُ بالعربیۃِ اَحَبُّ اِلیَّ من المدح بالفارسیّۃِ وسیعرفُ مِصداقَ قَولِی مَن تأمّلَ کتابَ عِلمٍ قد نُقِلَ الی الفارسِی کیف ذَھَبَ رونقہٗ وکسفَ بالُہٗ وَاسوَدَّ وجہُہٗ وَزالَ الانتفاعُ بہٖ اذ لا تصلحُ ھٰذہِ اللغۃ اِلاّ لِلاَخبار الکسرویّۃِ والاسمارِ اللّیلیّۃِ +

(ترجمہ) "دنیا کے تمام ملکوں کے علوم و فنون عربوں کی زبان میں منتقل ہو چکے ہیں، جس سے ان کو چار چاند لگ گئے ہیں۔ اور وہ لوگوں کے دلوں میں اتر گئے ہیں اور عربی زبان کے محاسن لوگوں کی شریانوں اور وریدوں میں سرایت کر گئے ہیں۔ ہر ایک قوم اپنی ہی زبان کو شیریں سمجھتی ہے، جس سے وہ مانوس ہے اور جس کی وہ عادی ہے اور جس کو وہ اپنے دوستوں اور ہمسروں کے ساتھ اپنی ضروریات میں استعمال کرتی ہے۔ پھر میں اپنے آپ پر قیاس کرتا ہوں۔ میری اپنی ملکی زبان (یعنی خوارزمی)

ایسی غیر منفقت ہے کہ اگر اس میں کوئی علم مدوّن کیا جائے تو وہ ایسا ہی عجیب وغریب نظر آئے گا جیسا کہ وہ اونٹ جو کسی پرنالے پر دیکھا جائے یا وہ زرافہ جو اصیل عربی گھوڑوں کے گلّہ میں پایا جائے۔ پھر عربی اور فارسی کو لیجئے۔ ان دونوں زبانوں میں میری حیثیت ایک اجنبی اور متکلف کی ہے۔ اگر کوئی شخص میری ہجو عربی میں کرے، تو وہ ہجو مجھے اس مدح وستائش سے زیادہ عزیز اور پسندیدہ ہوگی جو فارسی میں کی جائے۔ میرے قول کی صداقت اس شخص پر واضح ہو جائے گی جو کسی ایسی علمی کتاب پر نگاہ ڈالے جو فارسی میں ترجمہ کی گئی ہو۔ وہ دیکھے گا کہ اصل کتاب کی روح خستہ اور اس کی رونق پژمردہ ہو گئی ہے اس کی تابانی کو زنگ لگ گیا اور اس سے استفادہ ناممکن ہو گیا ہے، کیونکہ یہ زبان صرف ایرانی بادشاہوں کی داستانوں اور ان کی شبانہ محفلوں میں سنائے جانے والے افسانوں ہی کے لئے موزوں ومناسب ہے"۔

ایک مدّتِ دراز کی گمنامی اور کس مپرسی کے بعد فارسی زبان نے آخرکار دوبارہ سر نکالا اور علمی لحاظ سے اس میں ایک حرکت پیدا ہوئی۔ ایرانی علماء نے عربی زبان کی مذہبی اور علمی کتابوں کو فارسی میں منتقل کرنا شروع کیا اور ان تراجم کے علاوہ مستقل تصانیف کی بھی ابتدا کی۔ ان کوششوں کا مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکلا کہ فارسی زبان نے بھی ترقی کے زینہ پر قدم رکھا اور اس نے بالآخر دنیائے اسلام میں ایک علمی زبان کی حیثیت اختیار کر لی۔

ایران کی جدید زبان یعنی فارسی اور اس کے لٹریچر کا نشو ونمو ہر پہلو سے عربی ادبیات اور عربی اسالیبِ بیان کے زیر اثر ہوا۔ ایرانی شاعروں نے اُن بحروں اور اوزان کو اختیار کر لیا جو عربوں کے ہاں مروّج تھے۔ ایک عرصۂ دراز تک اصنافِ سخن اور مضامین کے انتخاب میں بھی وہ انہی کی پیروی کرتے رہے۔ نثر نگاروں کی تحریر بھی عربی ادیبوں کے اندازِ بیان سے متاثر ہوئی مثلاً مقاماتِ حریری کے نمونہ پر فارسی میں مقاماتِ حمیدی لکھے گئے۔ اور ان کی زبان بھی عربی الفاظ سے بھرپور تھی۔ ایران کے نحویوں نے جب فارسی گریمر کی تدوین کی تو وہی اصطلاحات اختیار کر لیں جو عربی صرف ونحو میں پہلے سے تجویز ہو چکی تھیں۔ یہی بات فارسی کے علم عروض اور علم بلاغت پر صادق آتی ہے۔

انہی وجوہ کی بنا پر پروفیسر براؤن اپنی لٹریری ہسٹری آف پرشیا (جلد اوّل صفحہ ۹۰) میں لکھتے ہیں کہ "مشرقی علوم کی تحصیل کی ابتداء میں نے ترکی زبان کے مطالعہ سے کی تھی، لیکن مجھے جلد ہی فارسی کی طرف توجہ کرنی پڑی، کیونکہ ترکوں نے اپنا تمدن اور اپنے اصنافِ ادب ایران ہی سے لئے تھے لیکن

میں جلد ہی اس بات سے آگاہ ہوگیا کہ عربی زبان و ادبیات اور عربی تمدن پر عبور حاصل کئے بغیر فارسی کی تحصیل کرنے والا شُد و بود سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔"

اگرچہ اہل ایران نے رفتہ رفتہ اپنے آپ کو عربوں کی حکومت اور ان کے اثرات سے ایک حد تک آزاد کر لیا، لیکن جو عربی الفاظ صدیوں سے عربی تسلط کے دوران ان کی زبان میں داخل ہو چکے تھے، وہ ان کی زبان کا جزء لاینفک بن کر رہ گئے۔ چنانچہ فارسی زبان میں آج تک عربی الفاظ کی کثیر تعداد موجود ہے، جن کا استعمال ناگزیر ہے اور جن کے بغیر فارسی لکھنا محال ہے، چنانچہ پروفیسر براؤن کتاب مذکور (جلد دوم صفحہ ۵) میں رقمطراز ہیں کہ "عربی الفاظ کے استعمال کے بغیر فارسی کا لکھنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا یونانی، لاطینی اور فرانسیسی کلمات کے بغیر انگریزی کا لکھنا دشوار ہے۔ فارسی تحریر میں عربی الفاظ سے کسی حد تک احتراز کیا جا سکتا ہے لیکن اس قسم کی تحریر ایک لغت کے بغیر بالعموم ناقابل فہم ہوگی۔ اس کے بعد پروفیسر موصوف نے جریدہ "اختر" اور "نامہ خسروان" کی مثال دی ہے اور لکھا ہے کہ ان میں فارسی کے ایسے متروک الفاظ کام میں لائے گئے ہیں جن کے معنے معلوم کرنے کے لئے لغت کی ضرورت پڑتی ہے۔

فردوسی اس کے بعد فاضل مذکور لکھتے ہیں کہ "بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ شاہنامہ عملی طور پر عربی زبان سے خالی ہے، لیکن یہ بات درست نہیں۔ یہ سچ ہے کہ فردوسی نے اپنی رزمیہ نظم میں حتی الامکان عربی الفاظ کے استعمال سے احتراز کرنے کی کوشش کی تھی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ عربی الفاظ اس کے نفس مضمون سے مناسبت نہیں رکھتے، لیکن فردوسی کے زمانے میں بھی عربی الفاظ فارسی زبان میں اس حد تک پیوست ہو چکے تھے کہ اس کے لئے ان کا استعمال ناگزیر تھا۔"

سعدی شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی (متوفی ۶۹۲ھ) اور خواجہ حافظ محمد شمس الدین شیرازی (متوفی ۷۹۱ھ) فارسی زبان کے چوٹی کے ادیب اور شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں اور آسمان ادب کے یہ شمس و قمر ایران اور اہل ایران کے لئے باعث صد فخر و نازش ہیں لیکن ان بزرگوں کے متعلق یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ ان کی طبائع میں اسلامی اور عربی ادب کا ذوق کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اور ان کا کلام اس امر پر شاہد عدل ہے۔

شیخ سعدی نے بغداد کے مدرسہ نظامیہ میں تعلیم پائی تھی، اور ان کو اسلامی روایات اور خصوصاً شہر بغداد کے ساتھ جو والہانہ عقیدت و محبت تھی وہ ان کے اس مشہور مرثیہ سے ثابت ہے، جو انھوں نے

سقوط بغداد (۶۵۶ھ) کے موقع پر کہا تھا۔ شیخ سعدی عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں بلا تکلف شعر کہتے تھے، چنانچہ ان کے کلیات میں فارسی قصائد کے ساتھ متعدد عربی قصائد بھی شامل ہیں۔ شیخ ممدوح نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں ذیل کا جو ہردلعزیز اور مقبول عالم عربی نعتیہ قطعہ لکھا تھا، اس کی سلاست اور زبان کی فصاحت وجزالت کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ قطعہ کسی عجمی نے لکھا ہوگا۔ وھو ھذا۔

بَلَغَ العُلیٰ بکمالِہٖ   کَشَفَ الدُّجیٰ بِجمالِہٖ

حَسُنَتْ جمیعُ خصالِہٖ   صَلُّوا علیہِ وَ آلِہٖ

حافظ اسی طرح خواجہ حافظ کو بھی عربی ادبیات کے ساتھ گہرا لگاؤ رہا ہے، اور وہ عربی نظم کہنے پر کمال قدرت رکھتے تھے، اور کیوں نہ ہو، انھوں نے اپنی طالب علمی کے ایام ہی میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا اور اسی مناسبت سے حافظ تخلص اختیار کیا تھا اور اس کے بعد ساری عمرِ عزیز ملازمتِ سلطانی کے علاوہ اسلامی عربی علوم کے درس وتدریس میں گزار دی تھی، اور وہ تعلیمی مشاغل میں اس قدر منہمک رہے کہ اپنی زندگی میں اپنا کلام معجز نظام بھی جمع نہ کر سکے، حالانکہ ان کا کلام ان کی زندگی ہی میں عالمگیر شہرت اور مقبولیت حاصل کر چکا تھا، جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں:

عراق و پارس گرفتی بشعر خود حافظ   بیا کہ نوبتِ بغداد و وقتِ تبریز است

جیسا کہ ناظرین کرام بخوبی جانتے ہیں، خواجہ حافظ کا کلام ان کی وفات کے بعد ان کے ایک قدر شناس محمد گلندام نے جمع کیا تھا۔ چنانچہ جامعِ دیوان اپنے دیباچہ میں لکھتے ہیں: "ولے محافظتِ درسِ قرآن وملازمتِ شغل سلطان وتحشیۂ کشّاف ومِصباح ومطالعۂ مطالع و مِفتاح وتحصیلِ قوانینِ ادب وتحسین دواوینِ عرب از جمعِ ابیات وغزلیاتش مانع آمدے واز تدوین واثباتِ ابیاتش وازع گشتے۔"

جو شخص کشّاف کے تحشیہ کی قدرت رکھتا ہو اور علامہ زمخشری جیسے ادیب لبیب کی تفسیر کا درس دے سکتا ہو، اس کے علم وفضل کا اندازہ لگانا کوئی مشکل امر نہیں ہے۔

خواجہ موصوف نے اپنے کلام میں عربی اور فارسی زبانوں کا ایسا دلپذیر امتزاج کیا ہے، جو مشرقی ادبیات میں خصوصی حیثیت رکھتا ہے۔ حافظ کی متعدد غزلیات ایسی ہیں جن میں شعر کا ایک مصرع اگر فارسی میں ہے تو دوسرا عربی میں ہے۔ اسی طرح کئی غزلیں ایسی ہیں جن کا ایک شعر اگر فارسی میں ہے تو دوسرا عربی زبان میں ہے۔ حافظ نے ان غزلیات میں فارسی اور عربی دونوں

کے ساتھ مطالعہ کرنا چاہیے، وہ ایرانی مصنّفین اور مفکرین کی عربی تصانیف کو نظر انداز نہیں کرسکتا اسی لئے اکثر اعلیٰ درس گاہوں اور دانش کدوں میں فارسی ادبیات کی تحقیق کے سلسلہ میں عربی زبان کا جاننا لابُدی سمجھا جاتا ہے، کیونکہ فتح اسلامی کے بعد ہر زمانہ کے ایرانی ادب میں عربی اثر اور عربی عنصر موجود رہا ہے، اور بہت سے علماء و فضلاء نے اپنی تصنیف و تالیف کے لئے عربی زبان ہی کو اختیار کیا ہے۔

فارسی زبان اور ادب کے سلسلہ میں عربی زبان کو جو اہمیت حاصل ہے، اہل ایران اس سے بخوبی آگاہ ہیں۔ چنانچہ ایرانی مدارس میں عربی زبان ابتدائی درجوں ہی سے لازمی طور پر پڑھائی جاتی ہے اور اس کی تعلیم صرف ادب اور آرٹس کے طلبہ تک محدود نہیں بلکہ علمی اصطلاحات کی تلاش میں قانون، طبّ اور دیگر فنون کی درس گاہوں میں بھی عربی سے اعتناء کیا جاتا ہے۔[1]

---

[1] صاحب مقالہ نے جب اس بحث کو چھیڑا ہے تو ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ ذیل میں ہند و پاک کے عظیم ترین فاضل ادیب اور ادب فارسی پر مستند شخصیت اورنٹیل کالج پنجاب یونیورسٹی، شعبہ فارسی کے جناب پروفیسر وزیر الحسن عابدی صاحب کا وہ مختصر و جامع مقدمہ یہاں درج کردیں جو موصوف نے انجمن ترقی عربی (پاکستان) کی طرف سے شائع ہونے والے عربی نصاب "پیارے نبیؐ کی پیاری زبان" کے ساتویں حصّہ کے لئے لکھا تھا:-

ایران میں جدید تعلیم کا کوئی شعبہ عربی سے بے نیاز نہیں ہے۔ ایرانی دانش گاہوں کی کوئی ڈگری اور ایرانی محکمۂ تعلیم کی کوئی سند عربی کے بغیر نہیں ملتی۔ ایرانیوں نے اپنے ہر نصاب میں نہ صرف عربی کو جگہ دی ہے، بلکہ اسے لازمی قرار دیا ہے۔ وہاں نہ صرف فارسی زبان و ادب کے شعبے میں کوئی امیدوار عربی کے بغیر سند یافتہ یا گریجویٹ یا ڈاکٹر نہیں بن سکتا۔ بلکہ عربی کے درس میں کامیاب ہوئے بغیر دوسرے شعبوں مثلاً سائنس، قانون، انجینئرنگ وغیرہ میں بھی ڈگری نہیں ملتی یہ کیفیت تہذیبِ نو کے مرکزوں اور جدید علوم کی دانش گاہوں میں ہے۔ ایران کے عام علمی ادبی حلقوں میں اور قدیم علوم کے مرکزوں میں عربی کا جو چرچا ہے، اس کی مثال غیر عرب ملک میں ملنی محال ہے۔ سینا و فارابی اور غزالی و رازی کے ملک میں آج بھی علمی فضیلت کا تاج عربی دان ہی کے سر پر نظر آتا ہے

ہنوز آں ابرِ رحمت دُرفشاں است
مے و مے خانہ با مہر و نشاں است

* (باقی اگلے صفحہ پر)

کچھ مدّت سے بعض ایرانی حلقوں میں اس بات کی کوشش جاری ہے کہ فارسی زبان سے عربی عنصر کو خارج کر دیا جائے۔ افسوس کہ اس قسم کی کوشش میں ایک غلط قسم کی قومی عصبیت کام کر رہی ہے۔ چنانچہ چند مصنفوں نے "نامہ خسروان" جیسی اعجوبہ زا کتابیں لکھ کر اس بارے میں عملی کوشش کی ہے، لیکن ان کو اس منصوبہ میں چنداں کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ مروّج اور مانوس عربی الفاظ کی جگہ جن فارسی الفاظ کو انھوں نے استعمال کیا ہے وہ متروک ہونے کی وجہ سے خود ایرانیوں کے لئے اب ناقابل فہم بن چکے ہیں اور ان کے معنوں کے لئے لغت دیکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اگر چند مغلق اور مشکل عربی کلمات کی جگہ آسان اور قریب الفہم فارسی الفاظ کو اختیار کیا جائے تو یہ امر قابل عمل ہے، اور اس پر کوئی معقول اعتراض بھی وارد نہیں ہو سکتا، لیکن اگر اس تحریک کا مقصود یہ ہے کہ ایک خاص پالیسی کے مطابق عربی الفاظ کو قطعاً خارج کیا جائے تو یہ بات خود فارسی زبان کے حق میں انتہائی درجہ مضر ثابت ہوگی، کیونکہ اس سے اس کی قوت بیانیہ کمزور ہو جائے گی۔ تاریخ شاہد ہے کہ آج تک فارسی زبان کو دنیائے ادب میں جو شوکت و طنطنہ حاصل ہوا وہ بیشتر عربی کے وسیع و وقیع ذخیرہ الفاظ ہی کی بدولت حاصل ہوا تھا اور میں اپنی ذمہ داری کے پورے احساس کے ساتھ اور پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ عربی الفاظ کے اخراج سے فارسی زبان تہی دامن رہ جائے گی اور اس کی قوت بیانی کو ایسا ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا جس کو نہ تو پہلوی پورا کر سکے گی اور نہ ہی فرانسیسی۔

(بقیہ صفحہ گزشتہ سے آگے) *

حیرت انگیز امر یہ ہے کہ فارسی زبان نے قدیم دور میں عربی سے جو کسب فیض کیا تھا، اس سے کہیں زیادہ اس جدید تہذیب و تمدن کے دور میں فارسی زبان کا جوہر قابل صحرائے عرب کے اس آفتاب درخشاں سے کسبِ نور کر رہا ہے۔ مگر افسوس' پاکستان کا قومی افق اور اردو زبان و ادب کا میدان ابھی تک اسی وہم کی تاریکی میں کفن پوش ہے کہ عربی الفاظ و اصطلاحات ہماری زبان اور دیسی بولیوں کو ثقیل اور غیر مانوس نہ بنا دیں اور کہیں ایسا نہ ہو کہ دہلی اور لکھنؤ کی یہ چکن اور ڈھاکے کی یہ ململ بوجھل نہ ہو جائے۔ کیا بوالعجبی ہے کہ اصفہان اور شیراز کا فرش گل پر آسودہ تخیّل عربی زبان کے بغیر سانس نہ لینا چاہے۔ لیکن ہمالہ اور کوہ مری کے دامن کی سال خوردہ سنگلاخ بولیوں اور سندھ و گنگ و جمن کی ترائی کھیوا پراکرتوں سے پیدا ہونے والی اُردو کو عربی کے نام سے زکام ہوتا ہے۔

پروفیسر موصوف کی یہ عبارت ایران میں عربی زبان کی مقبولیت کا مستند وثیقہ ہے۔ (مدیر)

عربی کا اثر ترکی زبان و ادب پر

ترکوں نے اسلامی اطوار اور ادبی اسالیب اوّلاً اہل ایران سے اخذ کئے تھے، ان کے ادبیات کا نشو و نمو فارسی ادب کے زیر اثر ہوا تھا۔ لیکن خود فارسی زبان و ادب میں عربی عنصر غالب تھا، جو لامحالہ فارسی ادب کے توسّط سے ترکی زبان و ادب میں بھی منتقل ہو گیا۔ اس کے علاوہ مذہبی تعلقات کی وجہ سے بھی عربی زبان براہِ راست ترکی زبان پر اثر انداز ہوئی۔ سلطنت عثمانیہ میں ابتداء ہی سے اسلامی قانون رائج تھا، لہذا فقہ اسلامی کا غائر مطالعہ کرنے اور ایک عمدہ قاضی بننے اور مذہبی مناصب پر فائز ہونے کے لئے عربی زبان کا علم ضروری تھا۔ خصوصاً جب سلطان سلیم کے عہد میں مصر بھی آل عثمان کی سلطنت میں شامل ہو گیا (۱۵۱۷ء) تو ترکی سلطنت اور مصر کے علمی حلقوں میں ارتباط بڑھنے سے عربی تمدن کے اثرات دولت عثمانیہ میں اور بھی راسخ ہو گئے۔ یہاں تک کہ استنبول اسلامی اور عربی علوم کا ایک اہم مرکز بن گیا، جہاں عربی دان علماء و فضلاء کی شاہانہ طریق سے قدر دانی اور سرپرستی ہوتی تھی اور جہاں کے کتب خانوں میں آج بھی عربی زبان کے لاکھ سوا لاکھ نفیس و نادر مخطوطات محفوظ ہیں۔ خود ترکوں کے ہاں عربی زبان کے بہت سے جیّد عالم اور نامور مصنف پیدا ہوئے ہیں، مثلاً طاش کوپری زادہ مصنفِ "مفتاح السعادۃ" "والشقاق النعمانیہ فی علماء الدولۃ العثمانیہ" اور حاجی خلیفہ مؤلف "کشف الظنون" اور منجم باشی مؤلف "تاریخ الاوّل"۔

دائرۂ اسلام میں داخل ہوتے ہی ترکوں نے اپنی زبان کی تحریر کے لئے عربی رسم الخط اختیار کر لیا تھا، چنانچہ ان کا دینی اور دنیوی لٹریچر جو ان کے علماء و فضلاء نے گزشتہ چھ صدیوں میں پیدا کیا ہے عربی رسم الخط میں محفوظ ہے۔ اگرچہ ترکوں نے ۱۹۲۸ء سے عربی کی جگہ لاطینی یعنی رومن رسم الخط اختیار کر رکھا ہے، مگر اس بات کی توقع عبث ہے کہ ان کا تمام گزشتہ لٹریچر جو مطبوعات اور مخطوطات کی صورت میں محفوظ ہے، رومن حروف میں منتقل ہو سکے، لہذا اس قدیم ترکی لٹریچر کو پڑھنے اور سمجھنے کے لئے عربی رسم الخط کا جاننا ضروری ہے۔

یہ وہ ادبی سرمایہ ہے جس میں اس بہادر قوم کے عسکری، سیاسی اور علمی کارنامے مسطور ہیں۔ اور یہ وہ یادگار کارنامے ہیں، جن پر یہ قوم بجا طور پر فخر کر سکتی ہے لیکن رسم الخط کی افسوسناک تبدیلی سے ترکوں کی نئی نسل اپنے اسلاف کے علمی، ادبی اور ثقافتی ورثہ سے بالکل کٹ گئی ہے۔ اسی ضمن میں میں ایک واقعہ ناظرین کرام کی عبرت کے لئے (اپنے خون جگر سے) لکھتا ہوں۔ میرے ایک پاکستانی

ہموطن جو میڈیکل ڈاکٹر ہیں کچھ عرصہ ہوا سرکاری وظیفہ پر ترکی گئے تھے۔ اور وہاں ڈیڑھ دو سال مقیم رہے تھے۔ واپسی پر انھوں نے وہاں کے جو مشاہدات سنائے، ان میں سے ایک واقعہ اس سلسلہ میں خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ انھوں نے مجھ سے بیان کیا کہ جب کبھی مجھے چند دن کی فرصت ملتی تھی، میں اپنے چند نوجوان ترک دوستوں کے ساتھ اطراف ملک کی سیر کرنے جاتا تھا، چنانچہ میں نے اس طریق سے وہاں کے متعدد شہروں مثلاً برُوصہ، قونیہ اور سمرنا وغیرہ کی سیاحت کی اور وہاں کے آثار و عمارات مثلاً مساجد، مقابر اور مدارس کو دیکھا۔ میں تھوڑی بہت فارسی اور عربی جانتا ہوں، چنانچہ ہم جہاں کہیں جاتے، میں وہاں کی عمارات کے کتبوں کو پڑھتا تھا اور پھر ان کے بارے میں اپنے نوجوان ترک دوستوں کو بتاتا کہ یہ عمارت فلاں مقصد سے فلاں بادشاہ یا امیر کبیر نے بنوائی تھی۔ اس کے معمار یا میر عمارت کا یہ نام تھا اور یہ عمارت فلاں سن میں تعمیر ہوئی تھی۔ غرضیکہ کتبوں کی عبارتوں سے جو کچھ میری سمجھ میں آتا، ان سے بیان کرتا تھا۔ ایک دن وہ متعجب ہو کر مجھ سے پوچھنے لگے: "یہ کیا بھید ہے کہ تم ہمارے آثار کو اور ہماری تاریخ کو ہم سے بہتر جانتے ہو؟" میں نے جواب دیا کہ "تمہاری تاریخ تمہارے آثار کے در و دیوار پر لکھی ہے، لیکن بُرا ہو اس نئے رسم الخط کا جس کی وجہ سے تم اپنے بزرگوں کے لکھے ہوئے کتبات کو پڑھنے سے قاصر ہو!" فاعتبِرُوا یا اُولی الالباب۔ اسلامی نقطۂ نظر سے اس صورتِ حال پر جتنا توجہ کیا جائے کم ہے!!۔

اس سلسلہ میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جب ۱۹۲۸ء میں مصطفیٰ کمال کی حکمران پارٹی نے آمریت اور استبداد سے کام لے کر رومن خط کو ترکی قوم پر مسلط کیا تو اس موقع پر مغربی علماء میں سے متعدد سلامت طبع اور انصاف پسند مستشرقین مثلاً پروفیسر گرمانوس (GERMANUS) جرمن پروفیسر کارل ہائنرش بیکر (C.H. BAKER) اور فرانسیسی مستشرق لوئی ماسینیوں (LOUIS MASS-IGNON) نے اس تبدیلی پر تعجب اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا اور اسے ترکوں کے حق میں مضر بتایا تھا۔ خصوصاً پروفیسر ماسینیون عربی زبان کے بڑے حامی تھے۔ انھوں نے ۱۹۴۸ء میں یونسکو (UNESCO) کے نام ایک محضر نامہ (MEMORANDUM) بھیجا تھا اور دلائل و براہین کے ساتھ اس بات کی وضاحت کی تھی کہ عربی کو اپنی ثقافت کی بناء پر دنیا کی زبانوں میں ایک بہت بلند مقام حاصل ہے

(باقی)